لوحِ ایام، ایران اور مختار مسعود

زاہد منیر عامر

Abstract:

This paper critically explores *Loh-e-Ayyam*, the third book by renowned Urdu prose stylist and civil servant **Mukhtar Masood**, set during his diplomatic tenure in Iran amidst the Iranian Revolution. Unlike typical bureaucrats, Masood immersed himself in the socio-political upheaval of 1979, documenting not only the historical events but also the psychological and cultural transformations of Iranian society. The book blends memoir, reportage, and philosophical reflection, capturing the revolution through the eyes of a participant-observer who willingly leaves the comfort of his diplomatic privilege to witness and record history in the making.

Masood's prose demonstrates aesthetic sensitivity, historical consciousness, and bureaucratic realism. He draws parallels between individual integrity and collective transformation, often using metaphors from literature, art, and architecture to critique political events. His experiences during street protests, economic shortages, and moments of near-death are recounted with literary depth and human insight. The work also includes satirical and humorous commentary on political figures, from Iran's Shah to Pakistan's Yahya Khan, using irony to expose vanity and failure.

The author's attention to detail—whether in estimating protest crowd sizes or describing Persian calligraphy and culture—underscores his commitment to accuracy and appreciation of beauty. Loh-e-Ayyam transcends the genre of political memoir by offering a profound meditation on power, revolution, and personal responsibility. Dr. Zahid Munir Amir contextualizes this work as a unique Urdu

narrative that bears witness to a world-changing moment while preserving the voice of a refined, patriotic, and self-aware civil servant.

لوح ایام، مشہور مصنف مختار مسعود (۱۵ دسمبر ۱۹۲۶۔ ۱۴ اپریل ۲۰۱۷) کی تیسری تصنیف ہے۔ آواز دوست[۱] ان کی پہلی اور سفر نصیب[۲] دوسری کتاب تھی۔ لوح ایام[۳] کی شان نزول ان کا ایران میں تقرر تھا جب وہ آر سی ڈی کے جنرل سیکریٹری ہو کر تہران پہنچے تو ان کے دل میں پہلے ہی سے اس قیام کے حوالے سے ایک کتاب لکھنے کا خیال تھا۔ اس ارادے میں کارکنان قضاوقدر نے ان کی یوں مدد کی کہ ان کے ورودِ ایران کے ساتھ ہی یہاں کے حالات میں تغیر و تبدل شروع ہو گیا جو ایران سے شاہ کے خروج اور انقلاب کی آمد پر منتج ہوا۔

یہاں آنے والی تبدیلی کو انھوں نے بہت گہری نگاہ سے دیکھا۔ عام طور سے بیوروکریٹ اور سفارت کار اپنے مقام بلند سے نیچے اترنا گوارا نہیں کرتے جس کے نتیجے میں وہ سالہا سال کسی معاشرے میں رہنے کے باوصف اس کی حقیقی صورت حال سے آگاہ نہیں ہو پاتے۔ مختار مسعود بھی ایک بڑے بیوروکریٹ تھے جو آر سی ڈی کے سیکریٹری جنرل[۴] کے منصب پر فائز ہونے کے باعث سفارت کاروں میں بھی شامل ہو گئے۔ اس حیثیت سے وہ سفیر کے ہم منصب تھے لیکن انھوں نے خود کو بلند سنگھاسن پر فائز رکھنے کی بجائے ایرانی معاشرے میں کروٹ لیتی تبدیلی کی لہروں کو قریب سے دیکھنے کا فیصلہ کیا چنانچہ اس کتاب میں ہمیں وہ انقلاب کے مختلف مراحل میں سڑکوں، بازاروں میں پھرتے اور ہجوم میں شامل ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک بار ان کی گاڑی کو بندوق بردار جوانوں نے گھیر لیا، وہ تو خیریت گزری انقلابیوں نے ان کی گاڑی کا شیشہ توڑ کر اپنی بندوقوں کو آزمانے کا فیصلہ نہیں کیا۔ زندگی اور موت کے درمیان باقی رہ جانے والے ان تیس سیکنڈز کو انھوں نے اپنے چار سالہ قیام ایران کا مشکل ترین وقت قرار دیا ہے۔ دراصل لوح ایام کا مصنف اس بات کا پورا شعور رکھتا ہے کہ وہ تاریخ بننے کے عمل میں شریک ہے۔ وہ نہ صرف خود اس عمل میں شریک ہونا پسند کرتا ہے بلکہ اپنے چودہ پندرہ سالہ بیٹے اور اپنی بیگم کو بھی ان لمحات کا گواہ بنانا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے لیے اپنا سکون و آرام چھوڑ کر اسے جلسوں جلوسوں میں شریک ہونا، انتہائی مخدوش حالات میں بھی دفتر سے چھٹی نہ کرنا، حالات کی خرابی کے باعث دفتر کے سارے عملے کو چھٹی دے دینا اور خود دفتر میں موجود رہنا، بلند ہوتے شعلوں اور برستی گولیوں میں بھی اپنے شوق فراواں کو ترک نہ کرنا، اپنے سفارتی منصب سے اتر کر سڑک پر آلتی پالتی مار کر بیٹھنا بھی اسے گوارا ہے۔ گھر کی صورت حال یہ ہے کہ برفانی موسم میں گھر کو گرم رکھنے والے انجن میں ڈیزل

نہیں، چولھا گرم کرنے کے لیے سلنڈر میں گیس نہیں، بجلی بند، فریج ناکارہ، گاڑی میں پٹرول صفر کے نشان پر اور پٹرول پمپ پر لمبی لمبی قطاریں، ٹیلی فون بند، خانساماں بیمار، گھر میں روٹی نہ سالن، اس کے باوصف مصنف کا انقلاب کے تاریخ ساز لمحوں کے عینی گواہ بننے کا شوق ماند نہیں پڑتا۔

اس کی طبیعت محققانہ ہے چونکہ اپنے کیریر میں اسے مختلف شہروں کی حکمرانی کا تجربہ حاصل رہا ہے اور حکومتیں حکام شہر سے جلے جلوسوں کے مظاہرین کی تعداد پوچھنے میں بہت حساس ہوتی ہیں لہذا اسے مظاہرین کی تعداد جانچنے کے کئی طریقے معلوم ہیں چنانچہ وہ ایران کے احتجاجی مظاہروں میں شریک مظاہرین کے حوالے سے حکومتی بیانات اور حکومت مخالف حلقوں کے مبالغہ آمیز بیانات پر بڑی اچھی طرح تنقید کر سکتا ہے اور مظاہرین کی صحیح تعداد کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ خاص طور پر ان مظاہروں میں، جن میں وہ خود ایک عینی شاہد کے طور پر موجود رہا۔ شرکا کی تعداد بتانے میں دنیائے صحافت کی مبالغہ آرائیوں پر اس کا وہ عملی تبصرہ بہت بلیغ ہے جو اس نے بادشاہی مسجد لاہور میں ہونے والی نماز عید کے شرکا کی تعداد کے حوالے سے کیا۔ اخبارات میں ہر سال "لاکھوں فرزندان توحید کی نماز عید میں شرکت" کی خبر پڑھ پڑھ کر وہ ہر بار عدم اطمینان محسوس کرتا ہے اور بالآخر ایک دن فیتہ لے کر بادشاہی مسجد جا پہنچتا ہے اور مسجد کے طول و عرض کی پیائش کر کے اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ

> "اگر ایک مصلا دو فٹ چوڑا اور تین فٹ لمبا ہو تو بادشاہی مسجد میں کل باون ہزار نمازی سما سکتے ہیں، اندازے کو بے اندازہ بڑھانے والے یہ کیوں نہیں سوچتے کہ ہر نشے کی طرح فریب کا نشہ بھی مہلک ہوتا ہے" ۵

اسے ایرانی قالین پسند ہیں، اس نے اپنے بچپن ہی سے ایرانی قالینوں کو افرنگی صوفوں کے ساتھ رکھے دیکھا تھا لیکن اس کی سادگی پسند طبیعت ایرانی قالین خریدنے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ وہ یہاں کے چار سالہ قیام کے بعد جب پاکستان جاتا ہے تو اس کے سامان میں ایرانی انسائیکلوپیڈیا تو ہوتا ہے نائین کے ایرانی قالین اور مظفریان کے خوش رنگ فیروزے نہیں البتہ وہ فن کا ایسا قدردان ہے کہ جب اس نے ایرانی خطاط احصائی سے ملاقات کی تو اس کے گھر کی دیوار پر آویزاں خطاطی کا ایک نمونہ اس کے دل میں اتر گیا۔ سفید چکنے کاغذ کو سیاہ رنگ کیا ہوا ہے، تصویر کے درمیانی حصے میں دو سطریں ہیں پہلی سطر میں ایک لفظ کی تکرار ہے ماہرانہ بے اختیاری کے ساتھ لکھا ہوا لفظ، الف کی طرح کھڑی نوکدار لکیریں، سفید اور سیاہی مائل سبز رنگ، دوسری سطر میں اسی لفظ کی تکرار ہے، وہی رنگ ہیں مگر لفظ الٹا ہے خط معکوس، مجموعی تاثر اندھیرے میں روشنی کی چند کرنوں کا ہوتا ہے، تجریدی نقاشی ہے، پڑھنے والے کو پہلی بار حرف یا لفظ کی تکرار نظر آتی ہے، غور سے دیکھیں تو کبھی لا نظر آتا ہے اور کبھی الہ ممکن ہے لا الہ لکھا ہو۔ نامکمل

الفاظ سیاہ رنگ کے پس منظر سے اجاگر ہوتے ہیں اور اسی میں گم ہو جاتے ہیں عبارت سیاہ رنگ کے پردے میں پوشیدہ ہے اندھیرے کے دوسری جانب کہیں نور ہی نور ہو گا مگر نظر اس حجاب کے پار دیکھنے سے قاصر ہے..... ۶

جن نگاہوں نے خطاطی کے اس نمونے کو اس امعان نظر سے دیکھا، وہ اس کے سحر سے آزاد نہ رہ سکیں اور بہ قول مصنف "دو ہفتے کے بعد وہ سہ رنگی تجریدی نقاشی احصائی کے گول کمرے کی شمالی دیوار سے اتر گئی، کسی نے اسے خریدا، بنڈل بنایا، جہاز پر چڑھایا اور پاکستان بھیج دیا" ۷۔ ظاہر ہے یہ "کسی" لوح ایام کے مصنف کے سوا کوئی اور نہیں۔ اس ساری تفصیل سے مصنف کی فنی اسرار و رموز سے وابستگی اور فن کی قدر دانی کا اندازہ لگانا دشوار نہیں۔

وہ بیوکریسی کا ایک نام ور رکن ہے اور لباس و آسائش کے جملہ لوازم سے بخوبی واقف ہے۔ صرف یہی نہیں اسے کپڑوں کے بڑے بڑے برانڈز سے بھی بخوبی آگاہی ہے وہ جب کسی سے ملتا ہے تو یہ بھی دیکھتا ہے کہ اس نے کس برانڈ کے کپڑے پہن رکھے ہیں؟ ان کا رنگ کیا ہے؟ پتلون شکنوں سے آزاد ہے یا پہننے والے نے اسے شکن آرائی کی اجازت دے رکھی ہے؟ شیو تازہ بنائی گئی ہے یا اسے کئی دن بیت چکے ہیں؟ پتلون کا کپڑا نیا ہے یا گردش روزگار سے گھس چکا ہے؟ اس کے پائنچے گول ہیں یا کریز کی سلامتی کے باعث بیضوی شکل اختیار کر رہے ہیں؟ وہ خود بھی پتلون کی کریز کا اتنا خیال رکھتا ہے کہ شاہ ایران سے ملاقات کے وقت کاخ سعد آباد میں جب اسے انتظار گاہ میں بیٹھنے کے لیے کہا جاتا ہے تو وہ اپنے لباس کی کریز بچانے کے خیال سے کھڑے رہنا پسند کرتا ہے کیونکہ یہاں آنے سے کچھ ہی پہلے رہائشی فلیٹ میں صوفے پیچھے ہٹا کر "فرش پر استری کے لیے جگہ بنائی گئی تھی، کوٹ کے کاندھوں میں گھٹنا گھسا کر اس کی شکنیں درست کی گئی تھیں، اتنے جتن کے ساتھ درست کیے جانے والے لباس کو وہ اے ڈی سی کے کمرۂ انتظار میں خراب کرنا پسند نہیں کرتا۔ وہ کریز کی پیدا کردہ عملی دشواریوں سے آگاہ ہے اور کسی کرنل صاحب کا یہ قول نقل کرتا ہے کہ "پتلون کی کریز کسی ایسے شخص کی ایجاد ہے جو مسلمانوں کو بے نماز بنانے پر مقرر تھا" لیکن ساتھ ہی اس پر یہ اعتراض بھی کرتا ہے کہ "کیا وہ سارے مسلمان تہجد گزار ہوتے ہیں جن کی پتلونیں سلوٹ سلوٹ اور شلواریں شکن شکن ہوتی ہیں" ۸

کتاب اگرچہ انقلاب ایران کے حوالے سے ہے لیکن مصنف متعدد مقامات پر فلیش بیک کی ٹیکنیک اختیار کرتے ہوئے ماضی کے دھندلکوں میں کھو جاتا ہے۔ یہ گم شدگی اس کی طبیعت اور زندگی کے متعدد پہلوؤں سے آشنائی کا باعث بنتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک بار جب اسے شیخ منظور الٰہی، بریگیڈیر محمد افضل اور مسعود محمود (جی وہی مشہور ایف ایس ایف والے مسعود محمود) کے ساتھ نواب

بہاولپور کے مہمان خانے میں شب باشی کا موقع ملا تو نوابی ٹھاٹھ باٹھ کے حامل جھولے کی طرح جھولتے سنہری پلنگ، سونے والے کو خود میں جذب کر لینے والے گدے، مرغابی کے پروں سے بھری دلائی اور تکیے چھوڑ کر وہ قالین پر چادر بچھا کر زمین پر سو جانے کو ترجیح دیتا ہے۔۹؎

وہ طنز کے تیروں سے کام لینا خوب جانتا ہے سابق پاکستانی صدر یحیٰ خان اس کے طنز کا ایک سے زائد بار ہدف بنے ہیں۔ ایک بار جب ان کے دیر تک ہنستے رہنے کا ذکر تھا تو اس نے کہا "جب ان کی ہنسی تھمی تو لوگوں کے رونے کی باری آگئی"۱۰؎ پاکستان کی تاریخ کے عظیم المیے سے واقف قاری اس جملے کی معنویت کی صحیح معنی میں داد دے سکتا ہے۔ اسی طرح ایرانی شہنشاہیت کے جشن میں جب یحیٰ خان نے منا کوکی شہزادی گریس کیلی کے کھلے کاندھوں پر ہاتھ پھیر کر یہ دیکھنا چاہا کہ ہالی وڈ کی اس سابق فلم ایکٹریس کی جلد واقعی اتنی شفاف اور ملائم ہے، جتنی نظر آتی ہے یا نشے کی وجہ سے ان کی آنکھیں دھوکا کھا رہی ہیں تو گریس کے ردِ عمل پر سفارتی آداب سے واقفیت رکھنے والوں کا کہنا تھا کہ اس نے پاکستان، صدر پاکستان اور یحیٰ خان تینوں کی توہین کی تھی۔ یہاں پہنچ کر لوح ایام کا مصنف کہتا ہے کہ "پاکستان میں اس واقعے کی اطلاع سے غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ رنج و غم مغربی پاکستان کے حصے میں آیا اور غصہ و غضب مشرقی پاکستان کے"۱۱؎ اگر زمانہ زیر بحث کے سیاسی پس منظر کو ذہن میں رکھا جائے تو رنج و غم کے مغربی پاکستان کے حصے میں آنے اور غصہ و غضب کے مشرقی پاکستان کے حصے میں آنے کی معنویت واضح ہو جاتی ہے۔ مشرقی پاکستان کے غصہ و غضب کی جڑیں گہری تھیں اور یہ غصہ و غضب ہی تھا جو مغربی پاکستان سے اس کے راستوں کی جدائی پر منتج ہوا۔ اسی صدر مملکت کے ایک اور کارنامے کا ذکر بھی نہایت عبرت ناک ہے۔ کتاب میں جہاں ایرانی شہنشاہیت کے دو ہزار پانصد سالہ جشن شاہنشاہی میں عالمی راہ نماؤں کی موجودگی میں یحیٰ خان کے ایک پام کی طرف منہ کر کے اس کی آبیاری کر دینے کا ذکر ہے وہاں مصنف کہتا ہے "ایسی آب پاشی سے سوائے نہال غم کے اور کونسا پودا ہے جو سرسبز ہو سکتا ہے۔ ہکا بکا شاہی مہمانوں نے منہ پھیر لیا، پاکستانی عملے پر گھڑوں پانی پڑ گیا اور یہ پانی ناصاف اور ناپاک تھا"۱۲؎ ان افسوس ناک تفصیلات کے بیان میں مصنف نے جس طرح سراج اورنگ آبادی کے شعر

چلی سمتِ غیب سے کیا ہوا کہ چمن ظہور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہو سو ہری رہی۱۳؎

کو اور "گھڑوں پانی پڑنے" کے اردو محاورے کو استعمال کیا ہے اور ان سے جو خجالت کشید کی ہے وہ قابل داد ہے۔ اسی طرح مصنف کا یہ کہنا کہ "جتنی دیر یحیٰ خان نے نہانے اور لباس تبدیل کرنے میں

لگائی اتنی دیر میں مارشل ٹیٹو نے مشرقی پاکستان کے مستقبل کے بارے میں اپنی رائے تبدیل کرلی" ۱۴؎ سابق صدر مملکت کے کردار کی کمزوریوں پر گہرا طنز ہے۔

انقلاب کے دنوں میں جب ہر جانب ہنگامے ہی ہنگامے تھے اور نارمل زندگی مفقود تھی تو ایک دن اس عمارت کی ایک منزل میں بھی آگ لگ گئی، جس میں مصنف کا دفتر واقع تھا۔ اس آگ کا منظر پیش کرتے ہوئے وہ بتاتا ہے کہ

> "آر سی ڈی کے دفتر کی چوتھی منزل کی کھڑکی سے دھواں اٹھتا نظر آرہا ہے، ہم لوگ صوفے پر بیٹھے ہوئے ہیں، شیشے کی میز پر چائے اور کافی رکھی ہوئی ہے۔ آگ، دھویں، چائے اور کافی کے درمیان زرا سا فاصلہ ہے۔ یہی کوئی سو دو سو میٹر ہو گا۔ اس فاصلے کے ایک طرف آگ، لہو اور انقلاب ہے اور دوسری طرف تماشابینی، سفید خون اور ٹھنڈا سفارتی گوشت" ۱۵؎

یہاں مصنف کے طنز کی لپیٹ میں اس کی اپنی ذات بھی آگئی ہے۔ آگ، لہو انقلاب، تماشابینی تو اپنی جگہ "ٹھنڈا سفارتی گوشت" دراصل منٹو کے افسانے "ٹھنڈا گوشت" کی طرف اشارہ ہے ۱۶؎ یہ افسانہ مارچ ۱۹۴۹ کے رسالہ جاوید میں شائع ہوا تو اس پر فحاشی کے الزام میں منٹو کو تین ماہ قید اور جرمانے کی سزا سنائی گئی تھی، نہیں کہا جاسکتا کہ اگر یہ کیس مختار مسعود صاحب کے پاس پیش ہوتا تو وہ منٹو کا ساتھ دیتے یا کیس کے محرک چودھری محمد حسین کے ساتھ کھڑے ہوتے تاہم یہاں انھوں نے "ٹھنڈا گوشت" کے بیچ ایک لفظ کا اضافہ کرکے اپنی سفارتی زندگی کے سیاق وسباق میں ٹھنڈے گوشت کی معنویت کو بدرجہا بڑھا دیا ہے۔ یہاں رک کر انور مسعود کا شعر بھی یاد کیا جاسکتا ہے.

اس وقت وہاں کون دھواں دیکھنے جائے

اخبار میں پڑھ لیں گے کہاں آگ لگی تھی ۱۷؎

جہاں تک طنز کی لپیٹ میں اس کی اپنی ذات کے درآنے کا تعلق ہے تو یہاں گویا اس نے خود کو یگانہ کے خیال سے ہم آہنگ کرلیا ہے جس نے کہا تھا کہ

اتنا تو زندگی کا کوئی حق ادا کرے

دیوانہ وار حال پر اپنے ہنسا کرے ۱۸؎

بیوروکریٹ شاعر مصطفیٰ زیدی کی خودکشی پر جب ان کے گھر سے "تصویر بتاں" کے نکلنے کا ذکر ہوتا ہے تو مصنف بتاتا ہے کہ "نیک دل حوصلہ مند گورنر نے ساری تصویریں غور سے دیکھیں اور

ہر ایک پر باری باری بہ آواز بلند لاحول بھیجی، چیف سیکریٹری نے بار بار لاحول پڑھنے اور بھلائی حاصل کرنے کا موقع کھو دیا، گورنر سارا ثواب اور ساری تصویریں سمیٹ کر لے گئے" ۱۹؎ صرف یہی نہیں کہ مصنف طنز کے نشتر چلانے میں مہارت رکھتا ہے بلکہ اس کی نثر کا دامن مزاح کے موتیوں سے بھی خالی نہیں۔ عام تاثر کے مطابق مصنف ایک سنجیدہ انسان ہے۔ یہ درست لیکن اس کے باطن میں ایک مزاح نگار بھی تھا جو گاہے سنجیدگی کی چادر سے سر نکالتا اور پھر اس گپھا میں گم ہو جایا کرتا تھا۔ تہران میں بادشاہ کی دعوت پر جاتے ہوئے جب اس نے اپنی سیکریٹری سے کہا کہ واپسی پر ایک کی بجائے دو گاڑیاں درکار ہوں گی تاکہ دوسری میں بادشاہ کے دیے ہوئے تحائف لائے جا سکیں تو سیکریٹری نے کہا کہ ایسی دعوتوں میں تحائف نہیں دیے جاتے، اس پر مصنف کا ایراد ملاحظہ ہو:

> "ابن خلدون نے لکھا ہے کہ نوشیروان کے ایک امیر کے یہاں تقریب تھی، چاندی کے خوانوں اور سونے کے پیالوں میں کھانا آیا۔ خوان کو چار لونڈیاں اٹھا کر لاتی تھیں اور چار آدمی ایک خوان پر بیٹھ جاتے تھے، کھانا ختم ہونے کے بعد وہی چار آدمی خوان، پیالوں اور لونڈیوں کو اپنے ہمراہ گھر لے جاتے تھے۔ وہ تو محض ایک درباری کی سخاوت تھی ظاہر ہے کہ شہنشاہ کے یہاں سے تو اس سے زیادہ تحائف ملیں گے۔ میں ابن خلدون کی بات کا اعتبار کروں یا تمھاری بات مانوں؟" ۲۰؎

مصنف اپنے سرکاری فرائض کی انجام دہی کے دوران اپنا قومی لباس زیب تن کیے رہتا ہے، بادشاہ کی جانب سے رات کے وقت دی جانے والی ایک دعوت میں اپنی سیاہ اچکن اور سفید شلوار کا خاکہ یوں اڑایا ہے کہ "میری کالی اچکن نے اندھیرے کے ساتھ ساز باز کر لی، دور سے دیکھنے والے کو یوں لگتا ہے جیسے گھٹنوں سے ٹخنوں تک کے ٹی کی سفید براق شلوار کے پائنچے آپ سے آپ باغ میں ٹہل رہے ہوں" ۲۱؎ اپنی سفید شلوار کا خاکہ اڑانے والا اس سیاہ فام مہمان کو کیسے معاف کر سکتا تھا جس کے والدین نے برعکس نہند نام زنگی کافور کے طور پر اس کا نام 'مسٹر وائٹ' رکھا ہوا تھا چنانچہ وہ کہتا ہے کہ "اس باوقار سیاہ فام شخص کو نام لے کر مخاطب کرنے والوں کو یوں لگتا ہے جیسے وہ کوئی سفید جھوٹ بول رہے ہوں" ۲۲؎ انقلاب کے دنوں میں آر سی ڈی کے دفتر میں غیر حاضری کی کیفیت بتاتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ "ایرانی خواتین کی حاضری بے قاعدہ ہے، جب وہ آجاتی ہیں تو پیچھے سے شوہروں یا ہونے والے شوہروں کا ٹیلیفون آجاتا ہے۔ ایک کہتا ہے دفتر چھوڑو اور فوراً گھر واپس آجاؤ دوسرا کہتا ہے تمھارے گھر کے راستہ میں خطرہ زیادہ ہے میرے گھر آجاؤ" ۲۳؎ "میرے گھر آجاؤ" میں حسن تعلیل اور حسن طلب کا جو رنگ اور اشتیاق کی جو حرارت پائی جاتی ہے، اس کے کیا کہنے۔ مصنف کو فارسی کا شیریں لہجہ اور اس کے سبک لغات بہت

پسند ہیں چنانچہ اس نے "الفاظ" کے عنوان سے پورا ایک باب سپرد قلم کیا ہے جس میں اس زبانِ شیریں کے خوب صورت اظہارات کی نشان دہی کی ہے لیکن اس میں بھی وہ اس زبان کے لیے اپنی تمام تر پسندیدگی کے باوصف چٹکی بھرنے سے نہیں رکتا اور کہتا ہے کہ "نو مسلم کو فارسی میں جدید الاسلام کہتے ہیں، ایسا لگتا ہے جیسے یہ کسی یتیم خانے یا مدرسے کا نام ہے جسے قربانی کی کھالیں دے کر ثواب دارین حاصل کر سکتے ہیں" ۲۴

آگے چل کر اس خیال کی توضیح یا اپنی اس تنقید پر مزید حاشیہ آرائی کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ

> "کسی کو نو مسلم کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کے ایمان کی پختگی اور عبادات میں شدید العمل ہونے کی گواہی دی جا رہی ہے۔ مسٹر جدید الاسلام کے بارے میں شبہ ہوتا ہے کہ فیشن کے طور پر اسلام میں داخل ہوئے ہیں جونہی فیشن بدلا یہ اسلام سے باہر یا بیزار ہو جائیں گے۔ جدید ہونے کی وجہ سے ان کے بنیاد پرست یا جہاد پسند ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ اندریں حالات مغرب کی خواہش ہو گی کہ جو لوگ یورپ اور امریکہ میں اسلام قبول کریں وہ جدید الاسلام ہوں نہ کہ نو مسلم" ۲۵

دیکھیے مصنف کے نکتہ رس ذہن نے ایک لفظی اظہار سے کیا کیا پہلو بر آمد کیے ہیں۔

جیسا کہ آغاز میں ذکر ہو چکا ہے کہ مصنف کا ایران میں تقرر آر سی ڈی کے سیکریٹری جنرل کی حیثیت سے ہوا تھا لیکن اس کتاب میں سوائے دو چار مقامات کے، آر سی ڈی کا ذکر کم ہی دیکھنے میں آتا ہے اس کا سبب ممکن ہے اداری ریکارڈ کے تحفظ کا عہد ہو لیکن مصنف کے تاثرات بھی بہت کم ہیں اور جو ہیں وہ اس قسم کے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ آر سی ڈی میں کام کم اور تکلفات زیادہ تھے مثلاً مصنف کا یہ کہنا کہ "آر سی ڈی نے اصل اور ضروری کام کی کمی کو مہمان نوازی کی مصروفیت سے پورا کرنے کی جو روایت قائم کی" ۲۶ شاید کام کی یہی کمی تھی جس کے باعث اس ادارے کا ذکر بہت کم ہوا یہاں تک کہ انقلاب کے بعد وہ دن آ پہنچا جب اخبار میں یہ چھوٹی سی خبر شائع ہوئی کہ "آر سی ڈی مردود شد" ۲۷ یعنی علاقائی تعاون برائے ترقی کا منصوبہ رد کر دیا گیا۔

اس کتاب کو انقلاب ایران کا رپورتاژ بھی کہا جا سکتا ہے لیکن ایسا رپورتاژ جس کے ذریعے ہم مصنف کی زندگی کی مصروفیات اور اس کے مشاغل کی جھلکیاں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ کتابوں کے انتخاب میں اس کی روش، اس کے پڑھنے کا طریقہ، سونے جاگنے کے معمولات، باقاعدگی سے دفتر جانے کا معمول، علی

گڑھ اور لاہور سے وابستہ بچپن اور جوانی کی یادیں اور بہت کچھ۔ مثال کے طور پر یہ کہ وہ شام کو سیر کا عادی ہے اس نے بتایا کہ

> "میں نے پارک شہنشاہی میں دو تین سال بڑی باقاعدگی سے سہ پہر کی سیر کی ہے، سوچا جانے سے پہلے ایک بار پھر چکر لگالوں، پارک کا نام بدل گیا ہے، سیڑھیوں کے ساتھ بادشاہوں کی مورتیاں نصب تھیں اب وہاں پایہ ستون خالی کھڑے ہیں باغ میں ہریالی اور چہل پہل دونوں کی کمی ہے، گھاس جھلس گئی ہے جو تھوڑے بہت لوگ نظر آتے ہیں وہ خاموش اور سنجیدہ ہیں شاید وہ اپنی خوشی سے نہیں آئے ڈاکٹر نے پارک کی سیر ان کے نسخہ میں لکھی ہے" ۲۸؎

اس آخری جملے سے مجید امجد کی نظم "مقبرۂ جہانگیر" یاد آتی ہے جس کی ہر جدول گل بیچ کے الجھاؤ میں شاعر نے کتنے صناعوں کی صد عمر عزیز کو آویزاں دیکھا ہے اور جہاں صبح سویرے سیر کے لیے آنے والوں پر شاعر کی نظر پڑتی ہے تو وہ پکار اٹھتا ہے۔

کتنے صناعوں کی صد عمر عزیز آویزاں

اس جگہ آج سحر خیز مریض آویزاں ۲۹؎

راقم نے نہ صرف اس پارک کو دریافت کیا بلکہ اس سڑک پر بھی پہنچا جہاں لوح ایام کے مصنف کی رہائش تھی اور جہاں قیام کے دوران گاہے برق اور گاہے لالٹین کی روشنی میں لوح ایام میں شامل روزنامچہ میں لکھا گیا۔ یہ خیابان ولیعصر اور خیابان نیلسن منڈیلا کے درمیان رابطے کی ایک سڑک خیابان اسفندیار ہے، جہاں تک اس پارک کا تعلق ہے جس کے بارے میں مصنف نے لکھا ہے کہ اس کے پایہ ستون مجسموں سے خالی ہو چکے ہیں، گھاس جھلس گئی ہے اور وہاں آنے والے لوگ بہت کم رہ گئے ہیں تو اس کے بارے میں یہ بتا دینا مناسب ہو گا کہ اس پارک کا نیا نام "پارک ملت" ہے اور جہاں پہلے بادشاہوں کے سر دیس (Bust) تھے وہاں اب فارسی کے بڑے بڑے ادیبوں، شاعروں اور دانش مندوں کے سر دیس (نیم مجسمے) ہیں، درمیان میں جو اکلوتا مکمل مجسمہ ایستادہ ہے اسے دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے مرزا غالب کھڑے ہوں لیکن حقیقت میں یہ انیسویں صدی کے ایرانی مدبر اور قاچاری دور کے رئیس الوزرا امیر کبیر مرزا تقی خان فراہانی (۱۷۸۱ء.....۱۸۵۲ء) کا مجسمہ ہے۔ کانسی کا بنا ہوا تین میٹر اونچا یہ مجسمہ اٹلی کے ایرانی نژاد مجسمہ ساز ابوالحسن صدیقی کی تخلیق ہے۔ پارک کی رونقیں لوٹ آئی ہیں صبح سویرے بڑی تعداد میں لوگ آتے ہیں اور میوزک لگا کر اس کی تھاپ پر گروہ در گروہ ایکسر سائز کرتے پائے جاتے ہیں۔ یہ ایرانی معاشرے کا ایک بہت صحت مند اور روشن پہلو ہے کہ جوان، بوڑھے، ذکور و اناث بڑے

اہتمام سے پارکوں میں جاتے اورورزش کرتے ہیں۔ باجماعت ورزش کا یہ منظر بہت دل خوش کن ہوتا ہے۔ بعض اوقات ان سطور کے راقم نے بھی اس میں شرکت کی۔

آر سی ڈی کا ادارہ تو باقی نہیں رہاالبتہ اس کی ترقی یافتہ شکل اکنامک کوآپریشن آرگنائزیشن کی شکل میں موجود ہے راقم نے اس کے کارپردازان سے سابق آر سی ڈی کے دفتر کے بارے میں جاننا چاہاتو انھیں اس کے حوالے سے بے خبرپایا۔ لوح ایام سے اس دفتر کا تہران کی الزبتھ بلوار پر ہونا معلوم ہوتا ہے۔اب تہران میں اس نام کی کوئی سڑک موجود نہیں ہے، تحقیق سے معلوم ہوا کہ الزبتھ بلوار کا موجودہ نام خیابان کشاورز ہے۔اور یہ وہی سڑک ہے جہاں راقم السطوراپنے دس برس پہلے کے سفر ایران میں قیام پذیر ہوا تھا اور جہاں اپنے حالیہ وردوایران کے وقت بھی دوہفتے سے زیادہ وقت گزارا تھا۔لوح ایام کا مصنف الزبتھ بلوار پر واقع اپنے دفتر کی کھڑکی سے جھانکتے ہوئے کہتا ہے:

> "دفتر کی کھڑکی سے فرح پارک کی جانب جھانکتا ہوں، معلوم نہیں پارک کا نیا نام کیا ہے البتہ یہ بات میرے علم میں ہے کہ اس پارک میں ہنرہای زیبا کے ادارے کے لیے جو عمارت بن رہی تھی اس کی کرین تین سال سے ایک ہی زاویے پر کھڑی ہے"[۳۰]

مصنف اپنے دفتر کی کھڑکی سے جس پارک کو دیکھا کرتا تھا اب اس کا نام "پارک لالہ" ہے لالہ، ٹیولپ کے پھول کو کہتے ہیں اور یہاں ٹیولپ کی بہاریں ہیں۔ خیابان کشاورز پر قیام کے دنوں میں راقم نے اس پارک کی بہاریں بھی دیکھی ہیں۔ علی الصبح خواتین وحضرات کے مجمعوں کو باہم کورس کی شکل میں ایکسر سائز کرتے اور صحت مندانہ تفریحات میں مشغول، خوش وقت ہوتے دیکھا ہے۔ یہ پارک تہران کے مرکزی علاقے اور تہران یونی ورسٹی کے شمال میں واقع ہے۔ اس وسیع وعریض پارک کے ایک جانب خیابان کشاورز ہے تو دوسری جانب خیابان ڈاکٹر فاطمی ہے۔ خیابان ڈاکٹر فاطمی پر سفارت خانہ پاکستان کی عمارت ہے۔ جہاں تک آر سی ڈی کے دفتر کا تعلق ہے تو وہ خیابان کشاورز اور خیابان فاطمی کو ملانے والی ایک ذیلی سڑک خیابان حجاب پر واقع تھا۔ وہ عمارت اب بھی موجود ہے۔ پارکِ لالہ ایک بہت بڑا کمپلیکس ہے جس کے مدخل میں عمر خیام کا ایک دیو قامت مجسمہ کسی شیشہ باز کی طرح سیاروں سے کھیل رہا ہے، ہنرہای زیبا کی جس زیر تعمیر عمارت کا ذکر مصنف نے کیا وہ مکمل ہو چکی ہے اور اب اس میں موزۂ ہنرہای زیبا واقع ہے۔

مصنف نے یہ بھی بتایا ہے کہ "کسی زمانے میں مجھے بھی گھڑ سواری بلکہ شہسواری کا شوق تھا اب صرف اس کی یاد باقی ہے جو اس شوق کا ذکر بڑے مبالغے کے ساتھ کرتی ہے" [۳۱] مصنف کی گھڑ سوای کا

آغاز اس کے دور طالب علمی سے ہوتا ہے، علی گڑھ میں سروجنی نائیڈو کی آمد پر طالب علموں کی جس گارد نے ان کا استقبال کیا تھا اس میں فوجی وردی پہنے نوجوان مختار مسعود نے گھوڑے پر سوار ہو کر ان کی پیش وائی کی تھی۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ سابق صدر ایوب خان نے ایک بار ماضی کے سرکاری افسروں کا ذکر کرتے ہوئے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا تھا کہ ماضی میں شہر کے حاکم گھوڑے پر سوار ہو کر شہر کا چکر لگایا کرتے تھے، اب حکام شہر گاڑیوں سے نیچے نہیں اترتے۔ اس پر انھیں بتایا گیا تھا کہ آپ کی انتظامیہ میں ایک جوان سی ایس پی آفیسر ایسا بھی ہے جو صبح سویرے گھوڑے پر سوار ہو کر لاہور کی نہر پر جلو پارک سے ٹھوکر نیاز بیگ تک کا سارا علاقہ گھوڑے پر سوار ہو کر طے کیا کرتا ہے تو ایوب خان نے اس بات سے خوش ہو کر اس سال مختار مسعود کو تمغہ ء قائداعظم سے نوازا تھا۔ مختار مسعود کے اپنے بہ قول یہ اس وقت کی بات ہے جب ابھی پاکستان میں پہلے مارشل لا کے نفاذ کو کوئی تین سال ہوئے تھے ۳۲۔ ۲۰۰۳ء میں دیا جانے والا ستارۂ امتیاز کا اعزاز اس کے علاوہ ہے جو جنرل پرویز مشرف کی حکومت کی جانب سے عوامی خدمت (پبلک سروس) کے اعتراف میں دیا گیا۔

مجموعی طور پر اس کتاب سے مصنف کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ ایک دلیر اور دانا شخص کی تصویر ہے جسے لمحے کی قوت کا اندازہ ہے اور جو گزرتے ہوئے لمحے کی اہمیت سے پوری طرح باخبر ہے۔ آواز دوست میں اس نے درخت کے بغیر بیل چڑھانے کا تجربہ کیا تھا یہاں اسے کہانی کا درخت میسر ہے جس پر واقعات کی بیل چڑھانا دشوار نہیں۔ اس بیل پر جہاں اس کی ذاتی زندگی اور پسند و ترجیحات کے پھول کھلے ہیں وہاں اس کا قومی اور بین الاقوامی شعور قاری پر یہ حقیقت بھی واضح کر رہا ہے کہ انقلاب ایک لفظ نہیں روح امم کی حیات کا نام ہے، اس کی خاطر قوموں کو بہت بھاری قیمت ادا کرنا ہوتی ہے اور انقلاب کو برقرار رکھنا اسے برپا کر لینے سے زیادہ مشکل کام ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ مصنف بہ قول خود جام سفال لے کر ایران آیا تھا اور جام جمشید لے کر لوٹا، حال لے کر آیا تھا اور مستقبل لے کر واپس ہوا، عالم خاک کی خبر لایا تھا اور عالم مثال کا پتا لے کر گیا، بند دروازے لایا تھا اور کھلی کھڑکی لے کر واپس ہوا۔ ۳۳

حوالہ جات:

۱۔ ''آواز دوست'' پہلی بار ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی، فروری ۲۰۱۷ء تک اس کے سینتیس ایڈیشن شائع ہو چکے تھے۔ یہ اردو کی مقبول ترین کتابوں میں سے ہے۔

۲۔ ''سفر نصیب'' کی اوّلین اشاعت ۱۹۸۱ء میں سامنے آئی۔ اگست ۲۰۱۹ء تک اس کے اٹھارہ ایڈیشن شائع ہو چکے تھے۔

۳۔ ''لوح ایام'' جنوری ۱۹۹۶ء میں پہلی بار سامنے آئی اس کے بعد ستمبر ۲۰۱۹ء تک اس کے انیس ایڈیشن شائع ہو چکے تھے۔

۴۔ آر سی ڈی پاکستان ایران اور ترکی کے درمیان علاقائی تعاون کا معاہدہ تھا جو ۱۹۶۴ء میں ہوا انقلاب ایران کے بعد یہ معاہدہ منسوخ کر دیا گیا موجودہ صورت میں ان ممالک کے ساتھ ،سات دوسرے ایشیائی ممالک نے مل کر اقتصادی تعاون کا معاہدہ اکنامک کوآپریشن آرگنائزیشن (ایکو) کر لیا ہے جس کا صدر دفتر تہران میں واقع ہے اور پاکستان کے نام ور سفات کار اور سابق سیکریٹری خارجہ ڈاکٹر اسد مجید (پ ۱۹۶۳ء) آج کل اس معاہدے کے سیکریٹری جنرل کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اکنامک کوآپریشن آرگنائزیشن کا ثقافتی ادارہ ایکو فرہنگی بھی آج کل پاکستان کے پاس ہے اور مورخ و سوانح نگار ڈاکٹر سعد ایس۔ خان (پ:۱۹۷۰ء) اس کے سربراہ ہیں۔

۵۔ لوحِ ایام، لاہور، مکتبہ تعمیرِ انسانیت، ستمبر ۲۰۰۹، ص ۲۰۶

۶۔ ایضاً، ص ۳۹۳ ۷۔ ایضاً، ص ۲۰۰

۸۔ ایضاً، ص ۱۳۵ ۹۔ ایضاً، ص ۳۶۳

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۵۵ ۱۱۔ ایضاً، ص ۳۷۰

۱۲۔ ایضاً، ص ۳۷۱

۱۳۔ سراج اورنگ آبادی، کلیاتِ سراج، مرتبہ: پروفیسر عبدالقادر سروری، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ۱۹۸۹ء، ص ۶۶۷۔

۱۴۔ لوحِ ایّام، محولہ بالا، ص ۳۷۰۔ ۱۵۔ ایضاً، ص ۲۲۶

۱۶۔ یہ پاکستان آنے کے بعد منٹو کا پہلا افسانہ تھا۔ احمد ندیم قاسمی اور چودھری نذیر احمد نے بالترتیب نقوش اور سویرہ میں یہ افسانہ شائع کرنے سے معذرت کر لی، جس پر عارف عبدالمتین نے اپنے رسالے "جاوید" کے مارچ ۱۹۴۹ کے شمارے میں شائع کر دیا۔ پریس برانچ کے چودھری محمد حسین کی تحریک پر اس افسانے کے خلاف مقدمہ دائر ہوا اور افسانہ نگار، مدیر، اور ناشر تینوں کو سزا سنائی گئی۔ اپیل دائر کیے جانے پر عدالت نے افسانے کو "سوقیانہ اور ناشائستہ" قرار دیتے ہوئے فحاشی کے الزام سے بری کر دیا اور یوں تینوں کی سزا معاف کر دی گئی۔ دیکھیے: سعادت حسن منٹو، ٹھنڈا گوشت، دہلی: ساقی بک ڈپو، ۱۹۸۹ء، مضمون: زحمتِ مہر درخشاں، نیز ص ۸۷۔

۱۷۔ انور مسعود، اک دریچہ اک چراغ، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۴۴۔

۱۸۔ یگانہ چنگیزی، کلیاتِ یگانہ، مرتبہ: مشفق خواجہ، ۲۰۰۳ء کے کراچی ایڈیشن کی عکسی اشاعت، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۳ء، ص ۴۹۴۔

۱۹۔ لوحِ ایام، محولہ بالا، ص ۳۶۰

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۲۵۔ ۲۱۔ ایضاً، ص ۱۲۷۔

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۵۳۔ ۲۳۔ ایضاً، ص ۱۹۱۔

۲۴۔ ایضاً، ص ۴۱۳۔

۲۵۔ محولہ بالا، جائے مذکور۔ ۲۶۔ ایضاً، ص ۱۶۵۔

۲۷۔ ایضاً، ص ۳۵۵ ۲۸۔ ایضاً، ص ۴۸۸۔

۲۹۔ مجید امجد، کلیاتِ مجید امجد، مرتبہ: ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، لاہور: ماورا پبلشرز، ۱۹۸۹ء، ص ۲۷۔

۳۰۔ ایضاً، ص ۴۹۴۔ ۳۱۔ ایضاً، ص ۴۰۴۔

۳۲۔ مختار مسعود، حرفِ شوق، لاہور: مکتبہ تعمیرِ انسانیت، ۲۰۱۸ء، ص ۳۴۴۔

۳۳۔ ایضاً، ص ۳۹۴۔